بنی اسرائیل پر نازل ہونے والے مَنّ کی حقیقت

از

سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

بنی اسرائیل پر نازل ہونے والے مَنّ کی حقیقت

ادبی دنیا کے جنوری نمبر میں مولوی نعیم الرحمٰن صاحب ایم۔ اے پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی کا ایک مضمون مَنّ کی ماہیت کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس امر پر بحث کی ہے کہ بنی اسرائیل پر جو مَنّ نازل ہوا تھا۔ اس کی حقیقت کیا تھی۔ انہوں نے اول تو تورات کے بعض حوالے نقل کر کے بتایا ہے کہ تورات کی رو سے مَنّ اور اس کے نزول کی حقیقت کیا تھی۔ پھر طبی طور پر مَنّ کی جو ماہیت بتائی جاتی ہے' وہ بیان کر کے بتایا ہے کہ تورات میں من کی بیان کردہ حقیقت طبی تفصیلات کے مطابق نہیں۔

مجھے یہ مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی کہ مسلمانوں میں بھی علمی تحقیق کا ذوق پیدا ہو رہا ہے اور وہ اس حالتِ جمود سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں جو "یہ کیا ہے" کہنے سے باز رکھ رہی تھی اور اسی خوشی میں اس مضمون کے متعلق میں بھی بعض باتیں کہنی چاہتا ہوں۔

بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر کنعان کی طرف آئے تو جس علاقہ میں سے انہیں گزرنا پڑا وہ بہت غیر آباد تھا اور دور دراز فاصلہ پر بعض شہر آباد تھے۔ اب تک یہ علاقہ ایسا ہی ہے اور اب بھی اس علاقہ سے گزرنا آسان نہیں۔ فلسطین پر انگریزی قبضہ کی وجہ سے اب اس علاقہ میں ریل جاری ہو گئی ہے اور سفر میں سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں لیکن اس غیر آبادی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کیونکہ یہ علاقہ آبادی کے قابل زمینوں سے خالی ہے اور بے آب و گیاہ میدانوں پر مشتمل ہے۔ ترکوں نے جنگ عظیم میں بہت کوشش کی کہ کسی طرح مصر میں داخل ہو کر انگلستان اور ہندوستان کے تعلقات قطع کر دیں لیکن پانی کی دقّت اور سامان خورونوش کی کمی کے سبب عقلوں کو حیرت میں ڈال دینے والی قربانی کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انگریزوں نے بھی شروع میں بہت زور مارا لیکن خشک اور چٹیل میدانوں کی وجہ سے وہ بھی سویز کے راستہ سے فلسطین میں داخل نہ ہو سکے۔ آخر جنرل ایلنبی نے نیل سے پانی لے کر

سویز کے اوپر سے نلوں کے ذریعہ سے پانی گزارا اور اس علاقہ کو جو بڑے شہروں کے لئے ناقابل تھا' قابلِ سکونت بنا دیا۔ صلیبی جنگوں کے وقت جب فلسطین اور شام کے محاذ پر یورپ کی تمام اقوام کے منتخب بہادر اس نیت سے ڈیرے ڈالے پڑے تھے کہ اسلام کے بڑھنے والے سیلاب کو روک دیں' اس وقت بھی دشتِ سینا مسلمانوں اور مسیحیوں سے رستہ دینے کا ٹیکس لیتا رہا تھا۔ نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کے ابتدائی حصہ میں نامعلوم کتنے اسلامی اور مسیحی لشکر پانی نہ ملنے اور کھانے کی کمی کے سبب اس دشت میں تباہ ہو گئے تھے۔

پانی کی کمی کے سبب گزرنے والے قافلوں کو لازماً ان چشموں یا تالابوں کے پاس سے گزرنا پڑتا تھا جو کہیں کہیں اس دشت میں پائے جاتے تھے اور اس وجہ سے جو فریق بھی غالب ہوتا تھا اسے دوسرے فریق کے آدمیوں کو مارنے کا ایک آسان بہانہ مل جاتا تھا۔ کیونکہ تھوڑے آدمی ان چشموں یا تالابوں پر مقرر کر دینے سے اس بات کی کافی ضمانت ہو جاتی تھی کہ حریف کے آدمی نقصان اٹھائے بغیر مصر سے فلسطین کی طرف نہیں جا سکتے۔ چنانچہ اسامہ بن منقذ اپنی کتاب "الاعتبار" میں لکھتے ہیں کہ الجعفر نامی چشمہ جو مصر اور فلسطین کے درمیان تھا کبھی کسی وقت فرنگیوں سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ ہمیشہ اس جگہ سے لوگوں کو بچ کر جانا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ انہیں سیف الدین ابن سالار وزیر مصر نے شاہ نور دین کے پاس بھیجا کہ وہ طبریہ پر حملہ کریں تو ہم مصر سے غزہ پر حملہ کر کے فرنگیوں کو وہاں قلعے بنانے سے روک دیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم الجعفر چشمہ پر پہنچے تو اتفاقاً فرنگی اُس وقت موجود نہ تھے لیکن طی قبیلہ میں سے بنو اُبَی خاندان کے کچھ لوگ وہاں تھے۔ جن کے جسم پر چمڑے کے سوا گوشت کا نام و نشان نہ تھا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور بالکل بدحال ہو رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں میں نے ان سے پوچھا تم لوگ یہاں کس طرح گزارہ کرتے ہو۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ مُردار کی ہڈیاں اُبال کر اس پر گزارہ کرتے ہیں اور کوئی چیز کھانے کی یہاں نہیں ہے۔ ان کے کُتّے بھی اسی پر گزارہ کرتے تھے۔ ہاں گھوڑے چشمہ کے ارد گرد کی گھاس پر گزارہ کرتے تھے۔ اسامہ لکھتے ہیں کہ میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ تم لوگ یہاں اس حالت میں کیوں پڑے ہو' دمشق کی طرف کیوں نہیں چلے گئے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ اس خیال سے کہ وہاں کی وباؤں سے ہمیں نقصان نہ پہنچے۔ اسامہ حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ کیسے بیوقوف لوگ تھے ان کی اس وقت کی حالت سے بڑھ کر وبا کیا نقصان پہنچا سکتی تھی۔

بنی اسرائیل اور دشتِ سینا

میری غرض اس واقعہ کے ذکر سے یہ ہے کہ دشتِ سینا ایک ایسا خطرناک علاقہ ہے کہ بڑی جماعتوں کے لئے بھی بغیر خاص انتظام کے اس میں سے گزرنا مشکل ہے اور اس میں قیام کرنا تو اور بھی مصیبت ہے۔ پھر بنی اسرائیل میں جن کے بیس سال سے زائد کے جوانوں میں سے جنگی خدمت کے قابل مردوں کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے اور جو بے سروسامانی کی حالت میں مصر سے بھاگے تھے اس علاقہ میں سے کس طرح گزرے اور کس طرح اڑتیں سال تک اس علاقہ میں انہوں نے بسر کیا۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو صدیوں سے دنیا کو حیرت میں ڈال رہا ہے۔ بائیبل نے اس کا جواب مَنّ کے نزول اور حورب کی چٹان میں بارہ چشموں کے پھوٹنے کے معجزہ سے دیا ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس مظلوم قوم کی خدا تعالیٰ نے مدد کی اور اپنے فضل سے اس نے ان کے لئے کھانے اور پینے کا سامان مہیا کیا۔ میں اِس وقت پانی کی تحقیق کو چھوڑتا ہوں اور مَنّ کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ اس کی حقیقت زیر بحث ہے۔

بائیبل کا بیان پڑھنے کے بعد طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ:۔

(۱) مَنّ کیا چیز تھی؟ (۲) کیا اس کا وجود معجزانہ تھا؟

(۳) کیا بنی اسرائیل اسے کھا کر ایک طویل مدت تک زندگی بسر کر سکتے تھے؟

پہلے سوال کا جواب دیتے وقت خود بخود یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس غذا کو مَنّ کا نام بنی اسرائیل نے دیا تھا یا پہلے سے اس کا یہ نام تھا اگر بنی اسرائیل نے اسے اسی نام سے پکارا تو کیوں؟ کیا اس غذا کی اندرونی خاصیت کی وجہ سے یا کسی اور دوسری وجہ سے' خروج باب ۱۶ آیت ۱۵ میں "مَنّ" کا سب سے پہلے ذکر ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل ایلیم روانہ ہوئے تو راستہ میں خوراک نہ ملنے کے سبب انہوں نے شور مچایا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے ان سے گوشت اور روٹی کا وعدہ کیا۔ شام کو بے شمار بٹیر جنگل میں آ گئے۔ جنہیں پکڑ کر انہوں نے گوشت کھایا اور صبح کے وقت ایک چیز زمین پر پڑی ملی۔ جو چھوٹی چھوٹی سفید رنگ کی تھی۔ جسے دیکھ کر بنی اسرائیل نے آپس میں کہا یہ من ہے؟ کیونکہ انہوں نے نہ جانا کہ وہ کیا ہے۔ اس پر موسیٰ نے ان سے کہا۔ یہ روٹی ہے جو خدا نے کھانے کو تم کو دی ہے۔

اس آیت کی بناء پر بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ "من" کا لفظ اس جگہ بطور استفہام استعمال ہوا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔ بعد میں یہی لفظ نام کے طور پر

بنی اسرائیل میں استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ اس باب (۱۶) کی آیت ۳۱ میں لکھا ہے۔

"اور اسرائیل کے گھرانے نے اس کا نام "من" رکھا۔"

بعض محققین جارج ایبوز [۲] کی اتباع میں اصل تشریح کو غلط سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ لفظوں کی مشابہت سے مغالطہ ہو گیا ہے۔ اصل میں یہ لفظ "منو" ہے اور قبطی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی قبطی زبان میں کھانے کے ہیں۔ اس لئے بنی اسرائیل نے من سوال اور استفہام کے طور پر اس کا نام نہیں رکھا بلکہ چونکہ خدا تعالیٰ نے کہا کہ یہ موعودہ روٹی ہے۔ انہوں نے اس کا نام "منا" یعنی خوراک رکھ دیا۔ کیونکہ اس کا کوئی اور نام انہیں معلوم نہ تھا۔ ان کا یہ خیال ہے کہ من استفہامیہ کا استعمال ارمیک زبان میں نہیں اور یہ قابلِ تعجب امر ہے کہ اس معنی میں جس میں ارمیک زبان کا کوئی اور لفظ استعمال نہیں ہوا' یہ لفظ مستعمل ہو جاتا۔ مگر مسٹر فیلڈ نے اس حیرت کو بائیبل کے ایک قدیم یونانی نسخہ سے دور کرنے کی کوشش کی۔ نیز اس نسخہ میں خروج باب ۱۶ آیت ۱۵ کے الفاظ "من ہے" کی بجائے "کیا یہ من ہے۔" ہیں اور اگر یہ فرق صحیح تسلیم کر لیا جائے تو من خوراک کے معنی میں درست ثابت ہوتا ہے اور استفہام کے الفاظ کا علیحدہ موجود ہونا واضح کر دیتا ہے کہ "من" کا لفظ اس جگہ استفہام کے طور پر استعمال نہیں ہوا تھا۔

اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ عبرانی کا لفظ جو اس جگہ استعمال ہوا ہے' اس کے معنی استفہام کے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہ لفظ بنی اسرائیل کی جلاوطنی اور اس کے بعد کے زمانہ میں ان معنوں میں صرف عزرا اور دانیال کی کتب میں استعمال ہوا ہے۔ جلاوطنی سے پہلے کے زمانہ میں اس کا استعمال ان معنوں میں نظر نہیں آتا اور اس وجہ سے بعض اہلِ نظر نے اسے ارمیک قرار دیا۔

ہم جب اس لفظ کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے تورات کے دوسرے مقامات کا مطالعہ کرتے ہیں کہ بے جان چیزوں کے متعلق سوال کرنے کا کیا طریق ہے' تو وہاں ہمیں ایک ایسی بات مل جاتی ہے جو اس سوال کو ہمارے لئے قطعی طور پر حل کر دیتی ہے اور وہ یہ کہ تورات میں جہاں بے جان چیزوں کے متعلق سوال کیا گیا ہے۔ وہاں "منہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے نہ کہ "من" کا اور جہاں جاندار چیزوں کے متعلق سوال کیا گیا ہے وہاں "ری" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ خروج باب ۴ آیت ۲ میں ہے۔

"پھر خدا نے موسیٰ سے کہا کہ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے۔ پھر وہ بولا عصا" اس جگہ عبرانی میں لفظ "م ز ہ" ہے۔ یعنی یہ کیا ہے۔ یہ الفاظ عربی کے الفاظ "مَاذَا" سے ملتے ہیں "م ز ہ" کا یہ استعمال غیر معمولی ہے۔ ورنہ احبار باب ۲۵۔ آیت ۲۰۔ شمار باب ۱۳ آیت ۱۹، ۱۔ سموئیل باب ۳ آیت ۱۷۔ زبور باب ۳ آیت ۱۲۰۔ امثال باب ۳۰ آیت ۴ اور دیگر مقامات میں "کیا" کے لئے لفظ "منہ" استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جاندار کے متعلق سوال کے موقع پر "کون" کے لئے پیدائش باب ۲۷ آیت ۱۸۔ ایضاً باب ۳۳ آیت ۵۔ خروج باب ۱۵ آیت ۱۱۔ اسموئیل باب ۲۵ آیت ۱۰۔ زبور باب ۴ آیت ۶ وغیرہ میں عبرانی کا لفظ "رمی" استعمال ہوا ہے۔ اس فرق کو دیکھ کر صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ کہ خروج باب ۱۶ میں جو "من" کا استعمال ہوا ہے وہ "کیا" کے معنوں میں نہیں۔ کیونکہ پرانی عبرانی زبان میں کیا کے لئے "من" نہیں بلکہ "منہ" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جلاوطنی اور اس کے بعد کے زمانہ میں جب "من" کا لفظ سوال کے لئے استعمال ہونے لگا تو اس سے بے جان نہیں بلکہ جاندار کے متعلق سوال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ عزرا باب ۵ آیت ۳، ۹ اور دانیال باب ۲ آیت ۱۵ میں "منْ" کا لفظ سوال کے لئے استعمال ہوا ہے۔ لیکن وہاں سوال جانداروں کے متعلق ہے پس معلوم ہوا کہ اول تو تورات کے نزول کے وقت "من" کا لفظ سوال کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ دوم بنی اسرائیل کی جلاوطنی کے زمانہ سے جب یہ لفظ سوال کے لئے استعمال ہونے لگا ہے اُس وقت بھی یہ لفظ قاعدہ کے طور پر جاندار چیزوں کے متعلق سوال کرنے کے لئے استعمال ہوتا تھا' نہ یہ کہ بے جان چیزوں کے متعلق۔ اور استثناء کے طور پر اگر کہیں اس کے خلاف استعمال ہوا ہے تو اسے بطور سند پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا خروج باب ۱۶ آیت ۱۵ میں "من ہے" کے معنی "کیا ہے" کے کرنا اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ "من" کو "من" اس لئے کہا گیا تھا کہ بنی اسرائیل نے اسے پہچاننے کی وجہ سے "من" کے لفظ سے اس کے متعلق سوال کیا تھا' درست نہیں۔

اور یہ غلط فہمی یورپی مصنفوں کو اس لئے ہوئی ہے کہ وہ عبرانی جیسی مُردہ زبان کی تحقیق کرتے وقت اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ عبرانی کی ماں عربی زبان زندہ موجود ہے۔ عبرانی الفاظ کی حقیقت کے سمجھنے میں جب مشکلات ہوں تو وہ عربی زبان سے مدد لے لیا کریں۔ اس موقع پر اگر وہ عربی سے مدد لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ عربی زبان میں "مَا" غیر ذی روح

کیلئے اور "من" ذی روح کے لئے استعمال ہوتا ہے اور پھر اس علم کی روشنی میں بائیبل کے الفاظ کو دیکھتے تو ان پر واضح ہو جاتا کہ یہی قاعدہ بائیبل کی عبرانی میں بھی مدنظر رکھا گیا ہے اور اس طرح اس لغزش سے بچ جاتے۔ مگر اتنی تعریف ان کی ضرور کرنی پڑتی ہے کہ انہوں نے یہ فرق ضرور محسوس کیا ہے کہ من کا لفظ سوال کے معنوں میں جلاوطنی کے زمانہ اور اس کے بعد استعمال ہوا ہے۔ [۳] پہلے نہیں اور اس کی بناء پر بعض نے من کے معنے استفہام کے سوا کچھ اور لینے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں' جارج ایبوز نے اس لفظ کو قبطی لفظ "منو" سے مأخوذ قرار دیا۔ جس کے معنی خوراک کے ہیں۔ اسی طرح JESENIUS نے اپنی لغت میں من کی وجہ تسمیہ عربی لفظ من سے بیان کی ہے۔ جس کے معنی فضل اور احسان کے ہیں۔ اس مصنف کے خیال کے مطابق اس چیز کا نام من اس لئے رکھا گیا تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوئی تھی اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ وجہ زیادہ قرین قیاس ہے۔

اب مَیں اس سوال کو لیتا ہوں کہ من کیا چیز تھی؟ جیسا کہ پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب نے کہا ہے بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شبنم کے ساتھ گرتی تھی اور سفید سفید گول دھنیے کے بیجوں کی طرح ہوتی تھی اور لوگ اسے چکی میں پیس کر یا اوکھلی میں کوٹ کر توے پر پکاتے تھے یا پُھلکیاں بناتے تھے اور اس کا مزا تازہ تیل کا سا تھا۔ جب دھوپ نکل آتی تو من پگھل جایا کرتا تھا۔ خروج باب ۱۶ آیت ۱۴ و گنتی باب ۱۱ آیت ۷۔ یہ چیز سبت کے دن نہیں گرتی تھی اور اگر لوگ جمع کرتے تھے تو سڑ جاتی تھی۔ سوائے سبت کے دن کے جو اس کے لئے جمع رکھی جاتی تھی وہ نہ سڑتی تھی۔ یہ من برابر اڑ تیس سال تک بنی اسرائیل پر نازل ہوتا رہا۔ گنتی باب ۲۱۔ اور اُس وقت بند ہوا جب انہوں نے موجودہ زمین میں قدم رکھا اور وہاں کا دانہ کھایا۔ یشوع باب ۵ آیت ۱۲۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا کوئی ایسی چیز ہے جو بائیبل کی بیان کردہ صفات کے مطابق ہو اور سینا مقام میں پائی جاتی ہو؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر معجزانہ امور کو نظرانداز کر دیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقعہ ایک ایسی چیز سینا کے علاقہ میں پائی جاتی ہے جو شبنم کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے اور دھوپ کی گرمی میں پگھل جاتی ہے اور تیل سا اس کا مزا ہوتا ہے اور سفید رنگ کی ہوتی ہے۔ جس کی ایک قسم کو ہمارے ملک میں شیر خشت کہتے ہیں اور دوسری کو ترنجبین اور ہندی میں اسے یورس۔ شرط کڑا یعنی جو اسے کی شکر کہتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان

میں یہ چیز جو اسے کے درخت سے نکالی جاتی ہے۔ لاطینی میں اسے "منا" کہتے ہیں اور اس چیز کی ماہیت پوری طرح طبی کتب میں بھی درج ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں بھی درج ہے۔ چنانچہ اسے پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب نے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے اس لئے میں اس مضمون کو چھوڑتا ہوں۔ ہاں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یورپی سیاحوں نے شہادت دی ہے کہ اب تک اس علاقہ میں **من** ملتا ہے گو وہ شبنم کے ساتھ نہیں گرتا بلکہ **ٹیمر کس گیلیکا** نامی درخت کا رس ہوتا ہے۔ جس کی چھال کو جب ایک کیڑا جسے **اب گاسپیر یا سینیفیرا** کہتے ہیں چھید تا ہے تو اس سے یہ رس ٹپکتا ہے بغیر کیڑے کے انسانی ہاتھوں سے درخت کی چھال میں شگاف کرنے سے بھی یہ رس گر کر جم جاتا ہے اور مختلف ممالک میں اس درخت سے مختلف طریقوں سے رس کو جمع کیا جاتا ہے۔ سسلی اور خراسان کا **من** مشہور ہے۔ ہندوستان میں بھی جو اسے کے درخت سے وید **من** بناتے ہیں۔ مصر سے مصنوعی **من** بنا ہوا آتا ہے لیکن اطباء اسے پہچان لیتے ہیں۔ بزمارڈٹ جرمن سیاح کا بیان ہے کہ سینا میں موجودہ درختوں کی تعداد کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ سالانہ اڑھائی تین سَو سیر تک **من** تیار ہو سکتا ہے مگر خیال کیا جاتا ہے کہ پہلے زمانہ میں جنگل زیادہ وسیع ہوتا تھا اور اس سے بہت زیادہ **من** تیار ہو سکتا تھا۔ لیکن جیسا کہ پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب نے لکھا ہے بائیبل میں بنی اسرائیل کی جو تعداد لکھی ہے اس کے مطابق انہیں روزانہ چھبیس ہزار سات سو پچاس من کے قریب **من** کی ضرورت ہوتی ہوگی اور سالانہ ایک کروڑ من کے قریب۔ لیکن چھ سات سو من سالانہ جو اَب وہاں پیدا ہوتا ہے اور ایک کروڑ من جس کی انہیں ضرورت ہوتی تھی، ان دونوں اندازوں میں اس قدر فرق ہے کہ خواہ قوتِ واہمہ کو کتنا ہی آزاد چھوڑ دیا جائے، خیال نہیں کیا جا سکتا کہ کسی زمانہ میں اس علاقہ میں اس قدر جنگل تھا کہ ایک کروڑ من مَنّ پیدا ہو جاتا تھا۔ خصوصاً جب ہم اس امر کو مدنظر رکھیں کہ اس علاقہ کا اکثر حصہ ایسا ہے کہ اس میں درخت پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔

ایک حل تو اس مشکل کا یہ ہے کہ ہم سمجھ لیں کہ بائیبل میں جو تعداد بنی اسرائیل کی لکھی ہے، وہ مبالغہ آمیز نہیں ہے۔ گنتی باب ا سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے بیس سال سے زائد عمر سے لڑنے کے قابل مردوں کی تعداد بارہویں قبیلہ کو چھوڑ کر جن کی گنتی نہیں کی گئی چھ لاکھ تین ہزار اور پانچ سو پچاس تھی اگر بارہویں قبیلہ کا اندازہ کر لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کل لڑنے کے قابل مرد ساڑھے چھ لاکھ تھے۔ عورتوں، بچوں اور جنگ کے

ناقابل بوڑھوں کی تعداد کا اندازہ لگانے کے لئے ہم اس تعداد کو دس گُنا زیادہ کر لیتے ہیں کیونکہ یہ ایک عام اندازہ ہے کہ چھ فیصدی سے لے کر دس فیصدی تک ملک کی آبادی جنگی خدمت کے قابل ہوتی ہے۔ ہم خیال کر لیتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں سختی سے جنگی خدمت لی جاتی تھی اور کُل تعداد بنی اسرائیل کی جنگی سپاہیوں سے صرف دس گُنی تھی۔ یعنی ۶۰ لاکھ۔

مگر عقل اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ بنی اسرائیل ساٹھ لاکھ تھے کیونکہ اتنے آدمی مصر سے اتنے قلیل عرصہ میں نکل ہی نہیں سکتے۔ پھر یردن پار کی بستی جس میں آکر وہ بسے ہیں' اس قدر آبادی کی حامل نہیں ہو سکتی۔ فلسطین کی آبادی کا اندازہ ۱۹۲۶ء میں آٹھ لاکھ باون ہزار دو سو اڑسٹھ تھا۔ [۴]

اس ملک کا کُل رقبہ ۹ ہزار مربع میل ہے یعنی پنجاب کے کُل رقبہ کا قریباً چودھواں حصہ اور پھر اس کا ایک بڑا حصہ ناقابل سکونت ہے' صرف ریت کے میدان ہیں جنہیں آباد نہیں کیا جا سکتا۔ پس اس ملک میں جو پہلے سے آباد تھا' ساٹھ لاکھ آدمیوں کا آکر بس جانا بالکل خلاف عقل ہے۔

ایک اور دلیل سے بھی یہ امر خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل ساٹھ لاکھ تو درکنار چند لاکھ بھی ہوں اور وہ اس طرح کہ حضرت اسحٰق کی پیدائش سے لے کر حضرت یعقوب کے مصر میں داخل ہونے تک تقریباً دو سو سال کا عرصہ بائیبل کے مطابق گزرا ہے۔ اس عرصہ میں حضرت ابراہیم کی نسل کے افراد بارہ تک پہنچے ہیں۔ عیسو کی اولاد کو بھی اگر اسی قدر فرض کر لیا جائے تو دو سَو سال میں چوبیس افراد تک ان کی نسل پہنچی ہے۔ اس کے بعد مصر سے نکلنے کے زمانہ تک دو سَو سال گزرے ہیں۔ پس عام اندازہ تو یہی ہو سکتا ہے کہ حضرت یعقوب کے بارہ بیٹوں کی نسل اس دو سَو سال میں چھ سات سَو افراد تک پہنچ گئی ہوگی لیکن اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ وہ بہت شادیاں کرتے تھے اور اولاد زیادہ ہوتی تھی جب بھی پندرہ بیس ہزار سے زائد تو کسی صورت میں ان کی تعداد نہیں ہو سکتی اور اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ بنی اسرائیل اپنے سفر کے دوران میں معمولی شہر کے آدمیوں سے بھی ڈرتے تھے اور ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دو اڑھائی ہزار سپاہیوں سے زائد نہ تھے اس اندازہ کے ماتحت مَن کی وہ مقدار جو بنی اسرائیل کیلئے ضروری ہوتی ہوگی بہت کم رہ جاتی ہے۔ لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ کیا بنی اسرائیل مَن پر گزارہ کر سکتے تھے۔ مَن جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ایک گوند ہے جو ہے بھی مُسہل۔ اس غذا پر انسان چند دن سے زائد گزارہ نہیں کر سکتا۔ پھر بنی اسرائیل

نے اڑتیس سال تک اس پر کیونکر گزارہ کیا۔ نئے یورپی محققین بھی اس سوال کی معقولیت کے قائل ہو گئے ہیں اور اب ان کا یہ خیال ہے کہ "من" کی جو ماہیت بائبل میں بتائی گئی ہے' اس میں مبالغہ اور تداخل ہو گیا ہے من ان کے نزدیک لچن (LICHEN) کے دانوں کا نام ہے جو قحط کے دنوں میں لوگ کھانے لگتے ہیں۔ لچن ایک بوٹی ہے جو سطح کے اوپر ہی اُگ آتی ہے۔ جڑ کے لئے اسے زمین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لئے چٹانوں کی سطح اور درختوں کی چھال پر بھی اُگ آتی ہے۔ اس کی بعض قسمیں پتھروں پر اُگتی ہیں۔ خصوصاً چولے کے پتھروں پر اور جب اسے پتھر سے الگ کیا جائے۔ تو جوار کے کُھلے ہوئے دانہ کے مشابہہ ہو جاتی ہے۔ جب یہ بوٹی پک جائے تو اس کے چھلکے جڑ سے الگ ہو کر گول شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ہلکا ہونے کی وجہ سے ہوا انہیں اڑا کر دور دور لے جاتی ہے۔[۵]

علمائے نباتات کے نزدیک یہ بُوٹی کُھمب کی قسموں میں سے ہے۔ اگر نئے یورپی محققین کی رائے تسلیم کر لی جائے تو پھر یہ سوال حل ہو جاتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس کھانے پر گزارہ کس طرح کیا؟ لیکن وہ سوال پھر پیدا ہو جاتا ہے کہ بائبل کی بیان کردہ من کی ماہیت کے ساتھ اس بُوٹی کی کوئی مناسبت نہیں۔ نہ یہ بوٹی میٹھی ہوتی ہے نہ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا ہوتا ہے اور نہ یہ بُوٹی دوپہر کو پگھل جاتی ہے۔

قرآن کریم و حدیث شریف سے استمداد

میرے نزدیک اس سوال کا جواب ہمیں بائبل اور ان کی متعلقہ کتب سے نہیں مل سکتا۔ یورپین محققین خواہ کتنا ہی زور لگائیں' وہ اس سوال کا پوری طرح جواب نہیں دے سکتے کیونکہ وہ اس سرچشمہ سے دور ہیں جس سے حقیقی علم عطا ہوتا ہے پس اگر ہمیں صحیح جواب کی ضرورت ہے تو ہمیں چاہئے کہ قرآن اور حدیث سے استمداد کریں۔

قرآن کریم اور حدیث میں مَنّ کے متعلق مندرجہ ذیل حقائق بیان ہوئے ہیں۔

(۱) **اَلَمْ تَرَاِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِ هِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ**[۶]

کیا تجھے ان لوگوں کا حال معلوم نہیں جو اپنے گھروں سے موت کے ڈر سے اس حال میں نکلے تھے کہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا کہ مرجاؤ پھر انہیں اس نے زندہ کر دیا۔

(۲) وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ [۷]
اور ہم نے تم پر من اور سلویٰ اتارا تھا اور کہا تھا کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے' اس میں سے اعلیٰ اور پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ۔

(۳) بخاری میں سعید بن زید کی روایت ہے۔ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْكَمْاَةُ مِنَ الْمَنِّ [۸] رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ کھمب بھی "مَنّ" کی اقسام میں سے ہے۔ ترمذی میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ اِنَّ نَاسًا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا اَلْكَمْاَةُ جُدَرِيُّ الْاَرْضِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْكَمْاَةُ مِنَ الْمَنِّ [۹] نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے بعض لوگ اعراب کے توہمات کے مطابق باتیں کر رہے تھے کہ کھمب زمین کی چیچک ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس بات کو سن کر فرمایا کہ کھمب "من" کی اقسام میں سے ہے۔

اوپر کی آیات و احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں مصر سے نہیں نکلے بلکہ ہزاروں کی تعداد میں نکلے تھے۔

(۴) جو چیز ان کے کھانے کے لئے مہیا کی گئی تھی وہ غذا کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی تھی اور ایسی نہ تھی جو غذائیت یا مزے کے لحاظ سے تکلیف دہ ہو۔

(۵) جو چیز بنی اسرائیل کو کھانے کے لئے ملی تھی وہ ایک چیز نہ تھی بلکہ کئی چیزیں تھیں اور ان کئی چیزوں میں سے ایک کھمب بھی تھی۔

یہ ایک نہایت عجیب بات ہے کہ "مَنّ" کا ذکر قرآن کریم میں تین جگہ پر آیا ہے ایک سورة بقرة میں ایک اعراف میں اور طٰهٰ میں اور تینوں جگہ اس کے ذکر کے بعد كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ [۱۰] کا فقرہ ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کی تردید کرنا مقصود ہے کہ وہ کھانا طبیعت پر بوجھ ڈالنے والا یا غذائیت کے لحاظ سے ادنیٰ قسم کا تھا۔

جیسا کہ ہم لچن (LICHEN) کی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے' تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کھمب کی قسم کا پودا ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے۔

"لچن اور کھمب کے اقسام بالکل آپس میں ملتے جلتے ہیں اور یہ امر ان اقسام کی مشابہت سے جو ایک دوسرے کی طبعی سرحد پر واقع ہیں بالکل ظاہر ہو جاتا ہے"۔ [۱۱]

لیکن یہ امر ظاہر ہے کہ لچن خود اچھا کھانا نہیں ہے بلکہ قحط کے ایام میں مجبوراً اسے لوگ

کھاتے ہیں۔ اس کے برعکس کھُمب اعلیٰ درجہ کے کھانوں میں سے ہے اور گراں قیمت پر فروخت ہوتی ہے اور خاص طور پر اسے امراء کے لئے بویا جاتا ہے اور فرانس میں تو اس کی اس قدر کھپت ہے کہ پیرس میں ایک زمیندار دن میں تین سے تین ہزار پونڈ تک کھُمب منڈی میں فروخت کرنے کے لئے بھیجتا ہے۔ اور پھر یہ ہے بھی جلد اُگنے والی چیز۔ چنانچہ انگریزی میں اس چیز کو جو جلد ہو جائے مشروم گروتھ (MASHROOM GROWTH) یعنی کھُمب کی طرح پیدا ہونے والی کہتے ہیں اور ایسے لوگوں کے لئے جو کھانے سے تنگ ہوں ایسی ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جو جلد اُگ آئیں اور جلد استعمال میں آسکیں۔ اب کیا یہ صاحبانِ بصیرت کے لئے عجیب بات نہیں کہ بائیبل کے کثیر نسخوں اور علمِ طبیعات کے ماہروں کی امداد کے باوجود یورپ بیسویں صدی میں جس نتیجہ پر "من" کے متعلق پہنچا ہے اور وہ بھی ناقص صورت میں' اس کی اب سے تیرہ سَو سال پہلے نہایت جامعیت کے ساتھ توضیح کر دی گئی تھی۔

احسانِ الٰہی سے ملنے والی غذا

میں جہاں تک مندرجہ بالا آیات اور احادیث سے سمجھ چکا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دشت سیناء میں کھُمب ترنجبین اور ایسی ہی اور چیزیں جو جلد تیار ہو جاتی ہیں' پیدا کر دیں جن سے بنی اسرائیل کو بآسانی غذا ملنے لگی اور چونکہ اس کے لئے محنت نہیں کرنی پڑتی تھی اس غذا کا نام من یعنی احسان الٰہی سے ملنے والی غذا رکھا گیا۔ وہ ایک قسم کی غذا نہ تھی بلکہ کئی قسم کی غذائیں تھیں۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ کئی طرح کا من تھا۔ وہاں سب میں ایک مشابہت تھی اور وہ یہ کہ غذائیں ہل چلا کر اور محنت کر کے بنی اسرائیل کو پیدا نہیں کرنی پڑتی تھیں۔ لیکن چونکہ غذائیں اور بٹیر جو اس وقت کثرت سے اس جنگل میں آ گئے تھے شکم میں قبض پیدا کرتے تھے' اللہ تعالیٰ نے ترنجبین بھی کثرت سے پیدا کر دی۔ جسے دوسری غذاؤں میں ملا کر کھانے سے ان کی صحت درست رہتی تھی۔ لہٰذا یہ حقیقت ہے کہ مَنّ جس کا کثرت سے ان ایام میں پیدا ہونا ایک معجزہ تھا' لیکن خود اس کا وجود اس دنیا کی چیزوں میں سے تھا وہ ایسی غذا تھی جسے ایک عرصہ تک کھایا جا سکتا تھا اور اس کی مصلح ترنجبین بھی ساتھ پیدا کر دی گئی تھی تاکہ جنگل کی خشک غذا صحت کو نقصان نہ پہنچائے۔

اس تشریح کے ساتھ سب سوال حل ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی کہ من کو لوگ دیر تک کس طرح کھاتے رہے اور یہ بھی کہ وہ سال بھر کس طرح ملتی رہتی تھی اور یہ بھی کہ وہ تیل کی

طرح بھی تھی اور اس سے روٹیاں بھی پکتی تھیں اور پھلکیاں بھی بنائی جاتی تھیں۔ کیونکہ وہ ایک چیز نہ تھی بلکہ کئی چیزوں کا نام من تھا اور اس تشریح کو تسلیم کر کے کوئی خلافِ عقل بات بھی تسلیم نہیں کرنی پڑتی۔ بٹیر وغیرہ کی قسم کی چیزوں پر ایک ایسی قوم جسے اہم سیاسی اغراض کے لئے جنگل میں رہنا ضروری ہے گذارہ کر سکتی ہے اور قرآن کریم کی بتائی مقدار کے مطابق قوم کا اس جنگل میں آسانی سے بسر اوقات کر سکنا ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ (ابن الفارس)

(منقول از مؤقر رسالہ "ادبی دنیا" مارچ ۱۹۳۱ء۔ الفضل ۲۲، ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء)

ل خروج باب ۱۶ آیت ۳۱ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی انار کلی لاہور۔ ۱۹۲۲ء

ل جارج ایبرز۔ (EBERS GEORG MORITZ) ۱۸۳۷ء کو برلن میں پیدا ہوا۔ ۷۔ اگست ۱۸۹۸ء کو TUTZING BAVARIA جرمنی میں وفات پائی۔ یہ جرمنی کا ناول نویس اور ماہر مصریات تھا۔ اس نے قانونِ فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ پھر برلن میں مشرقی زبانوں اور آثارِ قدیمہ کا مطالعہ کیا۔ ۱۸۶۵ء میں یونیورسٹی آف جینا (JENA) میں مصری زبان اور آثارِ قدیمہ کا استاد مقرر ہوا۔ ۱۸۷۰ء میں اس شعبہ میں جرمنی کے شہر LEIPZIG میں پروفیسر مقرر ہوا۔

The century Encylopedia of Names New York vol.1 p. 1388, 1399 published in 1825.

ل Encyclopedia Biblica vol.III London Page.2929.

ل انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا چودھواں ایڈیشن

ل Encyclopedia Biblica vol.III London Page.2929.

ل البقرۃ:۲۴۴ ے البقرۃ:۵۸

ل بخاری کتاب الطب باب المن شفاء للعین میں یہ روایت اس طرح ہے "قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول الکمأۃ من المن"

ل ترمذی ابواب الطب باب ما جاء فی الکماۃ والعجوۃ

ل البقرۃ:۵۸، الاعراف:۱۶۱، طٰہٰ:۸۲

ل Encyclopedia Britanica vol.14th Page.29Edition 14th.